یکم جولائی ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۵

اس شمارے میں

آل احمد سرور

حبیب صاحب

۲۲ جون کو رات کے آٹھ بجے پروفیسر محمد حبیب اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے. مرنے کے وقت ان کی عمر ۷۶ یا ۷۷ سال کی تھی. ہر یونی ورسٹی کے استادوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن کی عزت یونی ورسٹی سے نسبت کی وجہ سے ہوتی ہے. مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یونی ورسٹی کی عزت ہوتی ہے. حبیب صاحب ایسے ہی استادوں میں سے تھے. پروفیسر گنڈا سنگھ نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انھیں علی گڑھ آکر ایم. اے (تاریخ) میں داخلہ لینے کا خیال حبیب صاحب کی وجہ سے آیا. ایسی مثالیں بے شمار ہیں. حبیب صاحب ایک مثالی استاد تھے.

ان کا اصل کام پڑھنا، پڑھانا تھا اور طلبہ کی ریسرچ میں مدد دینا. وہ نہایت باقاعدگی سے کلاس لیتے تھے. میز پر اکثر چائے کی پیالی بھی دیکھی جاتی تھی. اکثر دو گھنٹے ملا کر پڑھاتے. ایسا بھی ہوتا کہ ان کا وقت ختم ہو جاتا اور انھیں خبر نہ ہوتی. مجھے یاد ہے ایسے موقعوں پر پروفیسر ابوبکر احمد حلیم جن کا کلاس ان کے فوراً بعد ہوتا، برآمدے میں بے چینی سے ٹہلتے تھے، یہاں تک کہ حبیب صاحب کی ان پر نظر پڑ جاتی اور وہ کلاس کو چھٹی دے دیتے.

حبیب صاحب ۱۹۵۸ء میں یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے، پھر پروفیسر ایمری ٹس مقرر ہوئے اور تاریخ اور سیاسیات کے شعبوں میں اس وقت تک پابندی سے درس دیتے رہے جب تک ان کی صحت نے اجازت دی. اس کے بعد بھی یونی ورسٹی کے علمی اجتماعات میں شریک ہوتے رہے. شعبۂ سیاسیات اور شعبۂ تاریخ کے کاموں میں مدد کرتے رہے. پڑھتے پڑھاتے رہے. مضامین لکھتے رہے طلبہ کی رہنمائی کرتے رہے، نہ کبھی توسیع کی درخواست کی، نہ اپنے لیے کچھ مطالبہ کیا. یونی ورسٹی تو ۱۹۵۸ء کے بعد بھی انھیں توسیع دینا چاہتی تھی مگر انھوں نے اسے پسند نہ کیا. استاد وہ ہے جس میں علم کی بصیرت ہو اور جو اپنی بصیرت کو عام کر سکے جو اپنے نوجوان ساتھیوں کو روشنی دکھائے، جو طالب علموں سے محبت اور شفقت سے پیش آئے اور ان کی دامے، درمے، سخنے، قدمے، مدد کر سکے. جو زندگی میں بعض اعلیٰ قدروں پر ایمان رکھتا ہو. جس کا اخلاق بلند ہو اور جو اپنے سماجی منصب کے وزن و وقار کو برقرار رکھے. حبیب صاحب میں یہ سب خوبیاں موجود تھیں. اس وجہ سے میں انھیں ایک مثالی استاد کہتا ہوں.

حبیب صاحب لکھنؤ کے ایک ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے. ان کے والد نسیم صاحب لکھنؤ کے بہت ممتاز وکیل اور رئیس

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۵ روپے

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

معروف شہری تھے۔ میں ان سے لکھنؤ میں اکثر ملا ہوں۔ ان کے بڑے بھائی محمد وسیم ایک مشہور بیرسٹر تھے۔ حبیب صاحب نے تو اپنے مضمون میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی، مگر ان سے چھوٹے بھائی محمد مجیب بھی جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ہیں ایک مشہور مورخ اور اردو اور انگریزی کے ایک مایۂ ناز مصنف ہیں۔

حبیب صاحب کی نسل کے بزرگوں میں یوں تو بہت سے علی گڑھ کے فدائی تھے، مگر دو کی ادا سے میں واقعی بہت متاثر ہوا، ایک حیدر خاں، دوسرے پروفیسر حبیب۔ حیدر خاں کا ۱۹۴۹ء میں انتقال ہو گیا۔ جب گاندھی جی اور مولانا محمد علی نے ایم اے او کالج کے طلبہ کو کالج چھوڑنے کی ترغیب دی تو حیدر خاں اس کے خلاف تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ اگر خانہ کعبہ اور علی گڑھ دونوں پر بمباری ہو رہی ہو اور آپ ایک کو بچا سکیں تو کسے بچائیں گے۔ حیدر خاں نے بغیر پس و پیش کے علی گڑھ کا نام لیا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ بات قابل اعتراض ضرور ہے مگر عاشق کا تو بہر حال احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔ حیدر خاں صاحب آدمی تھے۔ حبیب صاحب شروع سے قوم پرست تھے۔ مگر علی گڑھ سے عشق دونوں میں مشترک تھا دونوں شاید اسے جنت سے بھی بدلنے کو تیار نہ ہوتے۔ اکسفورڈ سے واپس آئے تو کچھ دن وہ اور ڈاکٹر ہادی حسن جامعہ میں رہے، پھر ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ آ گئے۔ جامعہ کی حالت اس زمانے میں نازک تھی۔ تحریک کا ولولہ سرد پڑ چکا تھا اور اس کے بانی سیاست کے ہنگاموں میں نئی تعلیم کے تجربے کو بھولتے جا رہے تھے۔ اس لئے حبیب صاحب اور ہادی صاحب کا علی گڑھ آ جانا فطری تھا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ پروفیسر ہو گئے۔ اس زمانے میں جب پروفیسر کوئی آسمانی مخلوق سمجھا جاتا تھا، حبیب صاحب کے یہاں نوجوان ساتھیوں اور طالب علموں کا میلا لگا رہتا۔ "محمود غزنوی" ان کی ابتدائی تصنیف ہے مگر اس کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔ اس کے بعد حبیب صاحب نے ازمنۂ وسطیٰ کی سیاسی اور سماجی اور ذہنی تاریخ پر درجنوں مضمون لکھے۔ انھیں یکجا کیا جائے تو کئی ہزار صفحات ہوں گے۔ وہ سیاسیات کے پروفیسر تھے اور علم سیاست کے مختلف نظریات سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ویسے وہ مارکس سے بہت متاثر تھے اور اپنے خیالات کے اعتبار سے مارکسی کہے جا سکتے ہیں۔ ہاں اس مارکسیت کے ساتھ قوم پرستی کا ایک گہرا رنگ بھی تھا۔

حبیب صاحب طلبہ کی جس فراخدلی سے مدد کرتے تھے اس کے متعلق علی گڑھ میں بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عرصے تک ان کی تنخواہ کا خاصا بڑا حصہ غریب اور مستحق طلبہ کی امداد پر صرف ہوتا تھا۔ جب بیگم حبیب کو علم ہوا تو انھوں نے اس امداد کی کچھ حدود مقرر کر دیں مگر حبیب صاحب ان کی پابندی کم ہی کر پاتے تھے۔ جو طالب علم اپنا افسانۂ درد لے کر ان کے پاس جاتا اس کی وہ دل کھول کر مدد کرتے اور دوسروں سے دلواتے۔ جب میں سرسید ہال اور آفتاب ہال کا پرووسٹ تھا تو حبیب صاحب کی طلبہ کی امداد کے لئے سفارشیں سب سے زیادہ ہوتی تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ سب طلبہ جن کو حبیب صاحب کسی وجہ سے مستحق سمجھتے تھے بالاخر اس امداد کے اہل ثابت نہ ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ حبیب صاحب یونی ورسٹی کے قواعد، تہذیبی روایات اور ضبط و نظم کے تقاضوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ جب وہ آفتاب ہال کے پرووسٹ تھے تو ایسا بھی ہوا کہ وہ جن طلبہ کو بہت عزیز رکھتے تھے ان میں سے بعض کے خلاف تادیبی کارروائی میں انھوں نے ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ چند مہ و سال کی بات ہے کسی ایم۔ اے کے طالب علم نے کسی لڑکی کے ساتھ بدتمیزی کی، حبیب صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ کچھ لڑکوں نے اس پر ہنگامہ کرنا چاہا مگر طلبہ کے بڑے طبقے کی طرف سے ان کی بالکل ہمت افزائی نہ ہوئی۔ حبیب صاحب کا معاملہ تھا، ان کا سبھی احترام کرتے تھے۔

حبیب صاحب شروع سے آخر تک قوم پرست رہے۔ آزادی سے پہلے علی گڑھ میں مسلم لیگ کا بہت زور تھا۔ حبیب صاحب حریت فکر کے قائل تھے۔ مگر اپنے عقیدے میں مضبوط۔ مجھے یاد ہے چودھری خلیق الزماں نے ۱۹۳۶ء میں اسٹریچی ہال میں تقریر کی اور بتایا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کا اختلاف کیوں شروع ہوا۔ انھوں نے اپنے رد عمل کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ مجمع نے خوب تالیاں بجائیں۔ حبیب صاحب صدر تھے انھوں نے چودھری صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ مگر نہ ان کی تائید کی نہ تردید۔ یونی ورسٹی میں وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ کس شخص کو اپنے مضمون سے لگاؤ ہے اور وہ پڑھتا لکھتا ہے یا نہیں۔ اس کے خیالات سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

حبیب صاحب دبلے پتلے، سیاہ فام، کم رو سے آدمی تھے۔ لباس کے معاملے میں خاصے بے پروا۔ مگر ان کے چہرے اور آنکھوں سے ذہانت اور ظرافت ٹپکتی تھی اور لوگ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ وہ بڑی اچھی تقریر کرتے تھے۔ بہت اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ ان کا خط بھی بڑا خوبصورت تھا۔ حبیب صاحب کو اردو زیادہ نہیں آتی تھی۔ اردو کی ان کی تقریر بہت پھس پھسی ہوتی تھی ان کے اردو کے جو مضامین ہیں وہ انگریزی سے ترجمے ہیں۔ ایک زمانے میں آگرے سے ایک رسالہ شیخ ان کی ادارت میں نکلا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس پر حبیب صاحب کا صرف نام تھا، کام دوسرے کرتے تھے۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے لئے میری فرمائش پر حبیب صاحب نے ایک سیر حاصل مضمون لکھا تھا یہ انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ ایک اور صاحب نے کیا تھا۔

حبیب صاحب نے یونی ورسٹی کی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ ہاں وہ جو بات صحیح سمجھتے تھے ضرور کہہ دیتے تھے وہ بڑے وضعدار آدمی تھے جس سے جیسا بھی رابطہ ہو گیا اسے آخر دم تک نبھا دیا۔ مگر ملک کی سیاست پر وہ برابر رائے دیتے رہتے تھے۔

حبیب صاحب کے دو لڑکے ہیں بڑا لڑکا پاکستان میں ہے چھوٹا عرفان حبیب شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ہے اور اس نوجوانی میں بھی

(باقی صفحہ ۶ پر)

پرکاش مونس

بکٹ کہانی اور افضل

بکٹ کہانی اور اس کے مصنف افضل کے بارے میں محمد انصار اللہ صاحب کا مراسلہ (ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۷۱ء) ایک خیال انگیز دعوت فکر دیتا ہے۔

بکٹ کہانی کے مصنف افضل کا تعین کرتے وقت یہ خیال رہنا چاہیے کہ تذکروں میں کسی افضل نامی شاعر کے ساتھ جب تک بکٹ کہانی یا بارہ ماسے کا نام، یا اس کا کوئی شعر بطور نمونہ درج نہ ہو یا اسی طرح کا کوئی اور واضح اشارہ موجود نہ ہو محض نام کے توارد کی بنا پر اسے بکٹ کہانی کا مصنف مان لینا احتیاط کے خلاف ہوگا۔ اس میزان پر اگر تذکرہ آفتاب عالمتاب اور تذکرہ روز روشن کے افضل تھانیسری اور تذکرہ واس ہوشگو کے "افضل کہ از استفادہ شاہ محمد ابو المعالی بود" کو جانچا جائے تو انھیں اس بحث میں شامل کرنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

یہی حال والہ داغستانی کے افضل پانی پتی کا ہے۔ والہ افضل کے ساتھ بکٹ کہانی یا بارہ ماسے کے انداز کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کرتے انھوں نے افضل پانی پتی کے جو ہندی و فارسی اشعار بطور نمونہ نقل کیے ہیں ان میں سے ایک مصرعہ بھی بکٹ کہانی کا نہیں ہے حالانکہ بکٹ کہانی میں فارسی مصرعوں کے گہرے چھینٹے کے علاوہ کم از کم اکتالیس اشعار کملاً فارسی کے موجود ہیں۔ بکٹ کہانی کی زبان کی جانچ پرکھ کی جائے تو وہ بھی مصنف کے ہریانوی ہونے کی صاف طور سے تردید کرتی ہے۔ اس کی زبان، زنانی پیاری بولی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ادبی زبان کی نسبت بول چال کی زبان پر مقامی اثرات کہیں زیادہ گہرے ہوتے ہیں لیکن محدودی

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب بکٹ کہانی کو ہریانی لسانی اثرات سے یکسر معرا بتاتے ہیں۔ (شعور زبان ۱۹۶۶ء ص ۱۲۷ تا ۱۲۹)

اگر والہ کے بیان "شعر ہندی و فارسی را بغایت خوب می گفت" کو کوئی دلیل بنایا جائے تو ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ خواجہ مسعود سعد سلمان سے امیر خسرو تک اور جعفر زٹلی سے شاہ آیت اللہ جوہری تک نہ معلوم کتنے شاعروں کے بارے میں ہم یہی بات سنتے چلے آ رہے ہیں اس لیے یہ کوئی ایسی تخصیص نہیں ہے کہ اس کی بنا پر افضل پانی پتی کو بکٹ کہانی کا مصنف مان لیا جائے۔ نہ افضل، شکر گنج۔ شمس العشاق۔ جانم اور باجن کی طرح کوئی غیر معمولی نام ہے۔ افضل تخلص ایک شاعر محی الدین نامہ نامی ایک مثنوی کے مصنف ملتے ہیں جن کے ایک ہندی فارسی یا ریختہ قسم کے قصیدے کا ایک شعر یہ ہے ؎

جہاں ہی جہاں گیانی، جہاں جانی جہانی
بلند طالع، بلند دانش، بلند حکمت بلند اختر
(رسالہ اردو کراچی اپریل ۱۹۵۰ء)

پروفیسر شیرانی بکٹ کہانی کے مقطع کے بعد والے ایک فارسی شعر ؎

بیاد دلربا خوشحال می باش
تجے افضل لگے گوپال می باش

کی سند پر گوپال کو افضل کا نام قرار دے کر انھیں والہ کی داستان کا سرو بتاتے ہیں حالانکہ والہ نے افضل کی داستان عشق نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کے باوجود گوپال کا کہیں نام نہیں لیا۔ صحیح تو یہ ہے کہ اس شعر میں گوپال تو گوپال، خود افضل بھی تخلص کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے دونوں نام محض مسلمان اور ہندو کے لیے تمثیلاً استعمال کیے گئے ہیں یہاں گوپال اور افضل، ڈاکٹر اقبال کے برہمن اور میتا ہیں۔ نہ شعر میں دلربا کوئی زن ہندو یا کوئی نام ہندو بچہ ہے بلکہ صرف پیار کا معروف محبوب، پیا، پیتم، کنت، سجن اور ساجن ہے شعر کا سیدھا سادہ مفہوم ہے، یا مسلمان اللہ اللہ یا برہمن رام رام! سے یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود بکٹ کہانی کے ایک نسخے کے آخر میں ایک شعر اس طرح بھی آتا ہے ؎

قصہ سارا کہا گوپال افضل
کو شدہ معشوق سوں عاشق کو جاسل

ریورنڈ حبیب ریحانی

غزل

جو قومیں حریف زماں ہو گئی ہیں
وہ تاریخ کی سرخیاں ہو گئی ہیں

جہاں ٹپکے ہیں خون دہقاں کے قطرے
زمینیں وہاں آسماں ہو گئی ہیں

بعزم جواں منزلیں کہکشاں تک
غبار رہ کارواں ہو گئی ہیں

بنی ہیں وہ قومیں ستاروں کی وارث
جو ذرات کی رازداں ہو گئی ہیں

صلیبوں کو دی اتنی زینت لہو سے
کہ وہ زندگی کا نشاں ہو گئی ہیں

جہاں لکھی ہیں داستانیں ہماری
محبت کی روح رواں ہو گئی ہیں

دی بجلیاں جو گری ہیں چمن پر
چراغ رہ آشیاں ہو گئی ہیں

دیا ہے جہاں خون ریحانی ہم نے
بہاریں وہاں جاوداں ہو گئی ہیں

چنانچہ بعض محققوں نے بکٹ کہانی کے مصنف ہی کا نام گوپال سمجھ لیا۔ محمد انصار اللہ صاحب نے بھی اس سلسلے میں ایک نئی گوپال تمیز تخلص کو کھوج نکالا۔ ظاہر ہے مقطع میں محض ایک سخن گسترانہ بات آپڑنے کی وجہ سے افضل یا اس کے محبوب کا نام گوپال خیال کر لینا غلط ہوگا۔

اگر بقول میر حسن، افضل نے حسب حال خود بارہ ماسہ موسوم بہ بکٹ کہانی لکھی تو بکٹ کہانی کی داخلی شہادت داؤد کی بیان کردہ داستان عشق کی صریحاً تکذیب کرتی ہے کیونکہ بکٹ کہانی سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ قصہ ہجر و فراق سے پہلے وصال محبوب سے محظوظ و شاد کام تھا۔ بکٹ کہانی میں بارہ ماسے کے شروع کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

پیا سے کر کے جب گر لگائی ۔ لے کر بھی ہاتھ
تمامی آگ تن من کی بجھائی ۔ ٹھ گر بھی لگے
چو شدہ دست پیا کے ساتھ رہتے
سخن با یک دگر سنتے و کہتے
جو حیلہ عشق نے دگر اٹھایا
فلک نے دشمنی سے پیچھے لگایا
مرا سکھ دیکھ اس کو رشک آئی
نہ دیکھ بر دلم داغ جدائی
بکٹ قصہ ہے مشکل کہانی
دوانی کی سنو سکھیں کہانی
ملن پا پیچھے بچھڑنا تو کٹھن ہے
کہو اب یہ زندگی کا کیا جتن ہے

(ابیات ۵۱ تا ۵۶)

داؤد کی داستان میں "ملن پا پیچھے بچھڑنا" کہاں؟ وہاں تو در اصل شروع سے ہی دراب تک مولانا "خوشبار سوائی و حال تباہ ہے سرمایہ درد آہ ہے و ڈنگا ہے" کا رونا روتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے آسانی وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ داؤد کی داستان میں بکٹ کہانی کا اور بکٹ کہانی میں داؤد کی داستان کا کوئی اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے بکٹ کہانی کو افضل پانی پتی کے سر تھوپنا ایک ادبی بے احتیاطی ہوگی۔

بکٹ کہانی کے مصنف کی حیثیت سے افضل کا نام لینے والوں میں قائم سرفہرست نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تذکرہ مخزن نکات (۱۱۶۸ھ) میں نہ صرف بکٹ کہانی کو افضل کی تصنیف بتایا بلکہ بکٹ کہانی کا ایک شعر بھی (مفرد سلسلہ) بطور نمونہ درج کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے افضل کو "از سکان دیار مشرق" بتایا۔ ان کے بعد میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو میں افضل کے ساتھ بکٹ کہانی کا نام لیا اور اس کے دو شعر نقل کیے۔ انھوں نے افضل کے بارے میں بعض نئی معلومات مثلاً "کہ اسم ہندو بچہ گوپال نامی بود کہ برو عاشق شدہ حسب حال خود بارہ ماسہ موسوم بکٹ کہانی گفتہ" بھی بہم پہنچائیں لیکن افضل کے وطن کے بارے میں وہ بالکل خاموش رہے۔

یہ ظاہر ہے کہ میر حسن قائم کا تذکرہ دیکھ چکے تھے لیکن وہ خود دیار مشرق کے بادیہ پیما تھے افضل کے وطن کے بارے میں ان کی خاموشی کے معنی یہی ہیں کہ وہ قائم کے "از سکان دیار مشرق" سے متفق نہ تھے اور خود انھیں اس بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ "از سکان دیار مشرق" پہلی ہی خود یہ پکار رہا ہے کہ قائم کو افضل کے وطن کے بارے میں محض ایک سطحی سا اندازہ تھا شاید انھوں نے بارہ ماسے کو جائسی اور دوسرے سکان مشرق صوفی شعرا سے مخصوص سمجھ کر افضل کو بھی اسی دیار کا باشندہ سمجھ لیا۔

اسپرنگر نے ۱۸۵۴ء میں شاہان اودھ کے کتب خانے کی فہرست شائع کی تو بکٹ کہانی کے مصنف افضل کا وطن صراحتاً "جھنجھانہ جو میرٹھ سے دور نہیں" بتایا۔ اب تک یہ خیال تھا کہ افضل کو جھنجھانوی بتانے والے اسپرنگر پہلے شخص ہیں لیکن محمد انصار اللہ صاحب کے مراسلے سے معلوم ہوا کہ تذکرہ قائم کے ایک دوسرے نسخے (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسین) میں بھی افضل کو "از سکان قصبہ جھنجھانہ" بتایا گیا ہے۔ اس سے نہ صرف اسپرنگر کے بیان کی تائید ہوتی ہے بلکہ اس دریافت کا سہرا بھی قائم کے ہی سر رہتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "از سکان دیار مشرق" بتانے کے بعد قائم کو افضل کے صحیح وطن جھنجھانہ کا علم ہوا اس لیے انھوں نے بعد میں اپنے تذکرے میں "دیار مشرق" کو "قصبہ جھنجھانہ" سے بدل دیا۔

اب اسٹیٹ لائبریری رام پور میں محفوظ بکٹ کہانی کے مخطوطے کو دیکھیے۔ اس پر "بکٹ کہانی از محمد افضل کالپی" لکھا ہوا ہے۔ (کالپی یوپی کے ضلع جالون کا ایک قصبہ ہے) اس سے یہ خیال کیا گیا کہ لفظ کالپی سے مراد کالپوی ہے۔ لائبریری کے مخطوطات کے فہرست نگار نے بکٹ کہانی کے مصنف کا نام صاف طور سے "محمد افضل کالپی والا" بتایا ہے۔ حالانکہ انھوں نے اپنی معلومات کے ماخذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے بکٹ کہانی کے متن کی ترتیب کے وقت اس کے کم از کم دس مخطوطات کا جائزہ لیا لیکن سوائے رام پوری نسخے کے کہیں اور افضل کے ساتھ لفظ کالپی کا اضافہ نہیں ملتا نہ کسی تذکرے میں کالپی کے کسی افضل نامی شاعر کا نام آتا ہے۔ "سفینہ خوشگو" میں تذکرہ شیخ محمد افضل مختصر تخلص از خلفائے میر سید محمد کالپوی، ہونے کی وجہ سے کالپی کا باشندہ نہیں قرار دیا جا سکتا جبکہ خود تذکرے میں انھیں غازی پور کے تابع موضع سید پور کا ساکن اور بعد میں الہ آباد

۱؎ قدیم اردو۔ جلد اول ۱۹۶۵ء ص ۲۰۲ تا ۲۰۴

جا بسنے کی وجہ سے صراحتاً الہ آبادی بتایا گیا ہے۔

اس طرح افضل کے وطن کے بارے میں ہمارے سامنے صرف اسپرنگر کا بیان جس کی قائم کے تذکرے (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسین) سے تائید ہوتی ہے رہ جاتا ہے جب تک اس کی کوئی معقول تردید نہ ہو افضل کو جھنجھانوی ہی مانا جانا چاہیے!

یہاں افضل کے زمانۂ حیات کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا۔ واکر نے افضل پانی پتی کا جو سال وفات دیا ہے وہ مصنف بکٹ کہانی کے سلسلے میں غیر متعلق ہے۔ اسپرنگر نے قائم کے حوالے سے افضل کو عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ حکومت سے پہلے کا شاعر بتایا ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے میں شعراء کے ادوار قائم کئے ہیں شمالی ہند کے شعراء سعدی، خسرو، نوری اور محمد افضل کے ذکر کے بعد وہ اردو ادب کا رشتہ دکن میں لے جاتے ہیں اور وہاں سب سے پہلے عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶ء تا ۱۶۷۲ء) کا ذکر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے عبداللہ قطب کے عہدِ حکومت سے افضل کے زمانۂ حیات کا تعین کرنا غلط ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قائم نے افضل کو جس دور کا شاعر مانا ہے وہ اس دور سے جو ۱۶۲۶ء سے شروع ہوتا ہے پہلے ختم ہو چکا تھا۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ افضل صاحب بکٹ کہانی کے متعلق آج ہماری معلومات صرف اتنی ہیں کہ وہ جھنجھانہ کے ساکن اور سترھویں صدی عیسوی کے ربع دوئم سے پہلے کے شاعر تھے!

مترجم ابر ہیم ناتھ دت

رگوید ۱۰ – ۱۱۷

— بھوک —

یقیناً خدا نے "بھوک" کو انسان کی موت کا سبب الاسباب نہیں بنایا تھا، اگر ایسا ہوتا تو تونگر کبھی نہ مرتے، مگر موت ان کو بھی حیلے بہانے سے آلیتی ہے۔ فیاض کی دولت کبھی ختم نہیں ہوتی اور کنجوس کتنا چاہے اس کو آسودگی دینے والا کون؟

فلاکت زدہ حاجت مند اجب روٹی کے ٹکڑے کے لیے ذخیرہ اندوز کے در پر سوالی ہوتا ہے کنجوس (ماضی میں چاہے اسی کے زیر احسان رہا ہو) منہ موڑ لیتا ہے۔ حاجت مند کو تسکین کا ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔

تونگر وہی ہے جو کم زور اور ضرورت مند لوگوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ وہ آئندہ کے لئے انھیں معاون بنا لیتا ہے، جنگ میں فتح اس کے قدم چومتی ہے۔

وہ دوست کیوں کر ہوا جو اپنے دوست اور رفیق کو مانگنے پر بھی کچھ نہیں دیتا اس کے گھر میں تسکین کہاں؟ اس کے ہاں سے بھاگ جانا مناسب ہے بہتر ہے کسی اجنبی کے آگے دست سوال دراز کرلے۔

تونگر کے لئے لازم ہے کہ ضرورت مند کی مشکل کشائی کرے اور اپنے انجام سے باخبر رہے۔ دولت گاڑی کے پہیے کی طرح مسلسل گردش میں ہے، آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے پاس دونوں ہاتھ دیکھنے میں تو ایک سے ہیں، مگر قوت کار میں مختلف ماں جائی بچھڑیاں ایک سا دودھ نہیں دیتیں، جوڑے بھائی طاقت اور قوت میں یکساں نہیں ہوتے نہ دو سگے بھائی دولت اور ثروت میں ایک جیسے!

ہنود کی کتاب مقدس میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

ذخیرہ اندوز

جو اناج کو خرید کر ذخیرہ اندوزی کرتا ہے تاکہ مہنگا ہونے پر نفع کمائے، تمہارا اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ "اگر یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو کہ وہ اپنی جائز ضروریات کے لئے اناج خریدتا ہے یا تحفظ کے پیش نظر اپنے ذاتی استعمال کے لئے ذخیرہ کرتا ہے، تو یہ خرید جلب منفعت کے لئے ہوئی اس میں کوئی خوبی یا برائی نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو مصیبت میں ڈال کر ناجائز نفع کمایا جائے۔ دانا لوگ اس کو "فعل قبیح" ہی کہیں گے۔"

اناج کی دوکان اگر اس لئے بند رکھی جائے کہ نیک اور بد کوئی بھی اناج نہ خرید سکے، نیک اور دانا آدمی اناج کے ضرورت مند ہوں، اناج خریدنے کے لئے دوکان پر جائیں، دوکاندار اس امید میں کہ نرخ بڑھنے پر اور نفع کماؤں گا۔ نرخ بازار پر فروخت

(باقی کالم ایک پر)

(باقی کالم ۲ سے آگے)

کرنے سے انکار کردے تو یہ ذخیرہ اندوزی غیر قانونی، غیر مجلسی اور انتہائی گناہ آلودہ ہے۔ نیک اور برگزیدہ آدمیوں کو اس نامعقول حرکت سے جو تکلیف ہوگی اس کی ذمہ داری اس ذخیرہ اندوز پر ہوگی جس نے اناج بیچنے سے انکار کر دیا ہے۔

مراسلات

صنم کا کھیل

جرأت کا شعر ہے :-

کچھ داغ جوانی میں نہیں عشق کا چمکا
طفلی میں بھی ہم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

اس شعر میں صنم کے کھیل سے کیا مراد ہے۔ بیت بازی کی طرح کا ایک تعلیمی کھیل تھا۔ بیت بازی کے لئے بچے بڑے شوق سے سیکڑوں شعر یاد کر ڈالتے ہیں۔ صنم کے کھیل کے لئے ان کو بہت سی چیزوں کے نام یاد رکھنا پڑتے تھے۔ یہ کھیل یوں کھیلا جاتا تھا کہ چند لڑکے ایک قطار میں بیٹھ جاتے تھے اور داہنی طرف سے حرف الف سے شروع کیا جاتا تھا۔ یعنی جو سوال پوچھا جائے اس کے جواب کا لفظ الف سے شروع ہو مثلاً

سوال۔ صنم از کجا آمد؟	جواب۔ از آذربائیجان
سوال۔ کجا می رود؟	جواب۔ اصفہان
سوال۔ بر چہ سوار است؟	جواب۔ بر اسپ
سوال۔ در دست چہ دارد؟	جواب۔ انگشتری
سوال۔ چہ پوشیدہ است؟	جواب۔ اچکن
سوال۔ چہ می خورد؟	جواب۔ انگور
سوال۔ چہ می نوشد؟	جواب۔ آب

اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے آسان سوال پوچھے جاتے تھے اور بچے ان کے جواب دیتے تھے۔ جرأت کے شاگرد شاہ حسین حقیقت نے اس کھیل پر ایک رسالہ "صنم کدۂ چین" کے نام سے لکھا جس میں ایسے سوالات کا اضافہ کر دیا جن کے جواب کے لئے وسیع معلومات اور کافی علمی استعداد کی ضرورت ہے مثلاً صنم کو کوئی عربی شعر یاد ہے؟ کوئی فارسی شعر یاد ہے؟ کوئی شعر ریختہ، کوئی دوہرا، کوئی کبت، کوئی عربی مثل، کوئی فارسی مثل، کوئی ہندی مثل، کوئی چیستان کوئی پہیلی یاد ہے؟ یہ سب سوال فارسی زبان میں پوچھے جاتے تھے۔

الف کے بعد حرف ب شروع ہوتا ہے اور اسی طرح کے سوالوں کے جواب حرف ب سے شروع ہونے والے دینا ہوتے ہیں یہ سلسلہ حرف ی تک چلا جاتا ہے۔ اب یہ کھیل بچوں کے لئے مخصوص نہیں رہا بلکہ بڑوں کے لئے بھی خاصا دلچسپ ہو گیا۔ حقیقت نے بڑی محنت کرکے ان سب سوالوں کے جواب لکھ دئے ہیں۔ رسالے میں بتیس صفحے ہیں اور ہر صفحے میں سترہ سوال ہیں۔ ہر صفحے کے حاشیے پر بہت سے الفاظ، اشعار، مثلیں وغیرہ لکھ دی ہیں جو اس کھیل میں کام آسکتی ہیں اور بہت سے غیر مانوس لفظوں کے معنی بھی لکھ دئے ہیں۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۰۹ھ ہے تصنیف کے چون برس بعد سنہ ۱۲۶۳ ہجری میں مصنف کے فرزند سید محسن علی مولف تذکرہ سراپا سخن نے اس کو مطبع محمدی لکھنؤ میں چھپوایا۔ اس کمیاب رسالے کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

لکھنؤ۔ • سید مسعود حسن رضوی ادیب

غالب کے شعر کے بارے میں

جناب نجم الحسن انجم ادیب کا مراسلہ پیش نظر ہے۔ انھیں جواباً "نہیں بلکہ تصدیقاً" لکھنا چاہئے تھا۔ ان کی تحریر سوال کا اثبات نہیں بلکہ میرے قول کی تصدیق ہے کہ

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غالب ہی کا شعر ہے۔ سند کلام میں انھوں نے میرے محترم دوست ڈاکٹر سید محمود اور جناب شوکت بلگرامی کو پیش کیا ہے جس سے مجھے اور تقویت ملتی ہے کیونکہ انھوں نے بھی وہی دلائل دی ہیں اور وہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ رزم اکبرآبادی کا شعر غالب کی ایک بھونڈی نقل ہے جس کا مضمون زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں اور میں سمجھ نہیں پایا کہ اس کی یہاں کیا ضرورت تھی۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور پھر اعادہ کرتا ہوں کہ غالب کے علاوہ اگر کوئی اور شاعر فکر کرتا تو "چند رشحات قلم، چند ادیبوں کے خطوط" سے آگے نہ بڑھ پاتا۔ میرے خیال میں اس شعر سے متعلق مزید بحث تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں۔

• پریم ناتھ دت۔ امرتسر

صفحہ ۸ سے آگے

اس نے اپنے مضمون میں نمایاں شہرت حاصل کی ہے۔ ضرورت ہے کہ حبیب صاحب کے مضامین جو رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں مرتب کرکے مناسب حواشی کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کئے جائیں۔ ان کے شاگردوں اور دوستوں کو ان کے نام پر یونیورسٹی میں سالانہ لیکچروں کا بھی انتظام کرنا چاہئے تاکہ ہمارے نوجوانوں میں تاریخی اور سیاسی بصیرت اور عام ہو اور وہ عقل کو ادب خوردہ دل بنا سکیں اور عشق کو "پیروی عقل خداداد" سکھا سکیں۔ علی گڑھ کی شمع روشن رہے گی اور اس کے گرد پروانے بھی رہیں گے۔ مگر پروفیسر حبیب جیسے استاد اب پیدا نہیں ہوں گے بقول میر (تھوڑے سے تصرف کے ساتھ)

مت سہل انھیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

▲

اخبار و اذکار

اردو کو اس کے جائز حقوق دلانے کی طرف پیش قدمی کا امکان

وزیر اعظم نے آج لوک سبھا میں وزارت داخلہ کے ۷۲-۱۹۷۱ء کے بجٹ مطالبات پر بحث کا جواب دیتے ہوئے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا کہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اردو زبان کو اس کی آئینی ضمانتیں حاصل ہوں وزیر اعظم نے یو، پی کے وزیر اعلیٰ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی ہے اور کچھ فیصلے بھی کئے گئے ہیں جن کا عنقریب نفاذ عمل میں آئے گا۔ بہار اور آندھرا پردیش میں بھی اردو بولنے والی آبادی کافی بڑی ہے تاہم آندھرا پردیش نے پہلے ہی اردو کو اس کا جائز مقام دینے کے لئے کچھ کیا ہے۔

• الجمعیۃ دہلی

اترپردیش کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے لئے سہولتوں کا وعدہ

نئی دہلی: وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے یہاں ۵۰ اردو ایڈیٹروں کو خطاب کرتے ہوئے اس بات کا وعدہ کیا کہ حکومت تعلیمی داروں میں اردو کی تعلیم کی سہولتوں کا جلد انتظام کرے گی۔

ان اردو ایڈیٹروں نے وزیر اعظم سے اپنی ملاقات کے دوران اردو کو نظر انداز کرنے پر اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا اور اس بات کی بھی شکایت کی تھی کہ یو، پی اور دوسری ریاستوں میں اس کے لئے تعلیمی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔

وزیر اعظم نے بتایا کہ میں نے اس کے بارے میں اترپردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر کملاپتی ترپاٹھی سے بات چیت کی تھی۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کریں گے خواہ سارے اسکول میں صرف ایک ہی لڑکا اسے پڑھنا چاہے۔

وزیر اعظم نے کہا کہ اگر اترپردیش میں یہ انتظام ٹھیک طور سے چلا تو پھر اسے بہار میں نافذ کیا جائے گا۔

مسز گاندھی نے بتایا کہ مسٹر ترپاٹھی نے اس بات کا بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ اس پر غور کریں گے کہ اردو کے لئے الکشن کے موقع پر جو وعدہ کیا گیا تھا اسے پورا کرنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایڈیٹر بنگلہ دیش پر ہونے والے سہ روزہ سیمنار میں شرکت کے لئے یہاں جمع ہوئے تھے۔

• قومی آواز

اردو اخبارات کے اڈیٹروں کو قومی مسائل کے سلسلے میں جاندار روئیہ اختیار کرنے کا مشورہ

دہلی: مرکزی وزیر امور داخلہ مسٹر کے سی۔ پنت نے اردو اخبارات کے اڈیٹروں کے سیمنار سے خطاب کرتے ہوئے اردو اخبارات کو قومی اور بین الاقوامی مسائل پر دور اندیشی کے ساتھ جاندار طریقۂ عمل اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ ان کو خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے طور پر خود ایک ضابطۂ اخلاق متعین کرنا چاہئے تاکہ غلط کار اخباروں سے وہ خود بخوبی نپٹ سکیں

انھوں نے بتایا کہ راجہ رام موہن رائے انھوں نے اردو کا پہلا اخبار شائع کیا تھا اس زمانہ سے اردو صحافت نے آزادی کی قومی جد و جہد اور عوامی مقاصد کی حمایت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہاں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ ملک کی تقسیم سے ذرا پہلے کچھ اردو اخبارات انگریزی سامراج کی لڑاؤ اور حکومت کرو پالیسی سے متاثر ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی زیادہ تر اردو اخبارات نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔

آپ نے مزید فرمایا کہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندوستان کے اردو اخباروں نے ہر حالت میں قومی پالیسی کی مکمل حمایت کی اور ایک زبان ہو کر ملکی سالمیت اور اتحاد کی حفاظت کے لئے آواز بلند کی۔ اس سے ان عناصر کو سخت ناکامی اور مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا جو موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اخباری دنیا کی ایک مختصر سی اقلیت اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے ہمیشہ انتشار پھیلانا چاہتی ہے۔ اخباری برادری کو ایسے عناصر کو باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ کر دینے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ مسٹر کے۔ سی۔ پنت نے کہا کہ اردو اخبارات اور رسائل ہندوستانی صحافت میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تعداد ۸۸۷ ہے۔ روزناموں میں ہندی اخبارات کے بعد اردو اخبارات کا نمبر دوسرا ہے۔ آپ نے کہا کہ اردو ہندوستان کی عظیم زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی آئین میں درج دفعات کے مطابق پوری حفاظت اور ہمت افزائی کی جائے گی۔ آپ نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ اردو کے سلسلے میں کچھ دشواریاں ہیں ہم ہمیشہ کانگریس کے انتخابی منشور میں اردو کے سلسلے میں جو وعدے کئے ہیں انھیں پورا کیا جائے گا۔ یو۔ پی کے سلسلے میں کچھ فیصلے ہو چکے ہیں جن کا وزیر اعظم نے گذشتہ روز اشارہ کیا تھا۔ بہار میں بھی اس سلسلہ میں بات چیت کی جائے گی۔ آپ نے کہا کہ اردو کا مسلمانوں سے تعلق قرار دینا سراسر غلط ہے۔ یہ زبان ایک مشترکہ تہذیب کی نمائندہ ہے جس کے بہت سے روشن پہلو ہیں۔ جمہوریت اور ترقی کی طاقتوں کو بڑھاوا دینے کے لئے دوسری زبانوں کے اخبارات کی طرح اردو اخبارات پر بھی بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ مسٹر کے سی۔ پنت نے اس امید کا اظہار کیا کہ اردو اخبارات بنگلہ دیش کی جمہوری جد و جہد میں بھرپور حمایت اور تعاون کریں گے اور ایسے حالات پیدا کرنے میں مدد دیں گے جو ساٹھ لاکھ پناہ گزینوں کے لئے پھر سے اپنے دیش میں حفاظت اور عزت کے ساتھ آباد

ہونے کا یقین دلائے۔ انھوں نے اس بات پر اطمینان ظاہر کیا کہ اردو اخبارات کی ایک بہت بڑی اکثریت پہلے ہی سے اپنا یہ فرض انجام دے رہی ہے۔

سیمینار میں اردو کے متعدد مدیران جرائد نے اپنی تقریروں میں بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کی مکمل حمایت کی۔

• ٹائمس آف انڈیا

بنگلہ دیش کی تحریک آزادی اردو اخبارات کا قابل تعریف رویہ

نئی دہلی:۔ اردو مدیران جرائد سیمینار کے اختتام پر پریس کانفرنس میں سیمینار کے کنوینروں نے کہا کہ بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں عام طور پر اردو اخبارات کا رویہ قابل تعریف رہا ہے دو ایک اخباروں کے سوا سب نے اس تحریک کی حمایت کی ہے۔

• الجمعیۃ دہلی

اردو مدیران جرائد کی بنگلہ دیش کے متعلق متفقہ رائے

نئی دہلی:۔ ہندوستان بھر کے اردو مدیران جرائد کا سہ روزہ سیمینار۔۔۔ یہاں ختم ہوگیا یہ سیمینار آل انڈیا اسمال اینڈ میڈیم نیوز پیپرس فیڈریشن اور پریس انشیا انٹرنیشنل کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا اس سیمینار میں ہندوستان کے طول و عرض سے ۸۰ نمائندوں نے حصہ لیا۔ سیمینار میں اردو صحافت کے مسائل بھی زیر بحث آئے۔

سیمینار کے خاتمہ پر یہ بیان جاری کیا گیا جس میں سیمینار کی متفقہ رائے کا اظہار کیا گیا۔

ہند و پاک تعلقات کے مسئلہ پر اور اس کے تمام مضمرات کا جائزہ لینے کے بعد ہندوستان بھر کے اردو اخبارات کے مدیران کا یہ سیمینار دکھ کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہے کہ صورت حال تیزی سے سنگین اور تشویشناک ہوتی جارہی ہے یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ برصغیر کے امن کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس صورت حال کی تمام تر ذمہ داری پاکستان کی فوجی حکومت کی اختیار کردہ جنگجویانہ اور غیر معقول پالیسیوں کا نتیجہ ہے وہ مسئلہ جس نے اس درجہ بھیانک شکل اختیار کرلی ہے بنگلہ دیش سے پناہ گزینوں کے امڈتے ہوئے سیلاب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔

اب یہ مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی مسئلہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ تمام دنیا کے لئے تشویشناک مسئلہ بن گیا ہے یقینی طور پر یہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ نہیں رہ گیا ہے بلکہ یہ اب ساری انسانیت کا مسئلہ بن چکا ہے۔

یہ سیمینار شدت سے یہ محسوس کرتا ہے کہ اب وہ وقت آچکا ہے کہ ہماری حکومت عالمی برادری سے اور خاص طور پر بڑی قوتوں سے دو ٹوک الفاظ میں کہدے کہ اگر اس مسئلہ کو جلد سے جلد حل نہیں کیا جاتا تو ہندوستان اپنے اہم قومی مفادات کے تحفظ کے لئے ہر ضروری قدم اٹھانے پر مجبور ہوجائے گا۔

ہمارا انداز فکر ہمیشہ قومی امنگوں سے ہم آہنگ رہا ہے اور حکومت قومی مفادات کے تحفظ کے لئے جو بھی جائز اقدامات کرے ہم اس کی پوری حمایت کرتے رہیں گے۔ یہ سیمینار امریکہ اور دیگر ممالک کی جانب سے پاکستان کو ہتھیاروں کی فراہمی کے خلاف اپنے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے۔

ہم اس موقعہ پر اس شر پسندانہ پروپیگنڈہ کی پرزور تردید کرتے ہوئے شدید مذمت کرتے ہیں جو ہندوستان اور دوسرے مقامات کے مفاد پرست حلقوں کی طرف سے ہندوستان کے سارے اردو پریس کے خلاف کیا جارہا ہے۔

اردو اخبارات ہندوستان کی قومی پالیسیوں ان کی تشکیل اور تکمیل کے لئے اہم کردار ادا کر رہے ہیں ساتھ ہی ہم اردو سمیت ان تمام اخبارات کی سختی سے مذمت کرتے ہیں جو قومی احساسات اور جذبات کی عکاسی میں ناکام رہے ہیں ہندوستان کے عوام کی آزادی کے محافظ کی حیثیت سے ہم ہندوستان کے آزاد پریس کی اعلیٰ روایات کے علمبردار ہیں ہم اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ دیانتدارانہ اختلاف رائے اور شر پسندانہ نیت کے ساتھ کئے جانے والے پروپیگنڈے میں فرق کیا جانا چاہیے۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ ہندو مسلم قومیت کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی جدوجہد ہے جو آزادی پسند قوتوں اور ظلم کے علمبرداروں کے درمیان جاری ہے۔

ہم ہندوستانیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ بنگلہ دیش کے عوام کی جدوجہد کی پرزور حمایت جاری رکھیں تاکہ بنگلہ دیش کے

عوام اپنی جدوجہد اور مقاصد میں جلد از جلد کامیاب ہوسکیں یہ اردو صحافت کی شاندار روایات کے مطابق بھی ہوگا اور ہماری قومی پالیسیوں کا آئینہ دار بھی۔ • الجمعیۃ دہلی

اردو اخبارات کا فی ہزار تناسب اشاعت

نئی دہلی: ۔ اردو اخبارات و رسائل کی تعداد بہت کثیر ہے یہ اخبارات سات کروڑ مسلم رائے عامہ کی تشکیل میں اور ان کے مسائل و مشکلات کو قومی سطح پر پیش کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اردو روزناموں کی تعداد ۱۰۳ ہے جو انگریزی سے زیادہ ہے اور ہندی اخبارات کی تعداد کا تقریباً نصف ہے انگریزی روزناموں کی تعداد صرف ۸۸ ہے۔

ہفتہ وار اردو اخبارات کی تعداد ۴۳۹ ہے اردو کی دوسری مطبوعات کی تعداد ۳۹۰ ہے تعداد اشاعت کے لحاظ سے اردو اخبارات کا چوتھا نمبر ہے اور یہ تعداد تین لاکھ چھ ہزار ہے اردو کا تناسب اس لحاظ سے ہندی سے بہتر ہے کہ ہندی بولنے والوں میں ایک ہزار نفوس کے لئے صرف ۲۳٫۷ کا پی کا تناسب ہے جبکہ اردو کا یہ تناسب ۱۳٫۷ ہے۔

• الجمعیۃ دہلی

میں اردو کی ٹھوس خدمت کرنا چاہتا ہوں

مونگیر: ۔ مرکزی نائب وزیر تعلیم "شری دیونندن پرشاد یادو" نے ایک اعزازی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میرے دل میں اردو کی قدر ہے، میں اس کی بھی خدمت کروں گا۔ مجھے اردو کی ترقی سے خوشی ہوگی۔ آپ مجھے مشورہ دیجئے۔

• قومی آواز لکھنؤ

اردو کو اس کا مستحق مقام دینے کا وعدہ

حیدرآباد: ۔ مسٹر پی نرسا ریڈی صدر پردیش کانگریس کمیٹی نے کہا ہے کہ ملک بالخصوص آندھرا پردیش میں اردو کا مستقبل درخشاں رہے گا۔ جہاں کہیں اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے اور طلبہ کی مطلوبہ تعداد ہو وہاں ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ برسر اقتدار کانگریس نے لوک سبھا کے عبوری مدت کے چناؤ کے موقع پر اپنے منشور میں اردو کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی کا ذکر کیا ہے اب کانگریس اردو کو اس کا مستحقہ اور جائز مقام دے گی مسٹر پی نرسا ریڈی بزم تعمیر ادب اردو عادل آباد کے زیر اہتمام ایک خیر مقدمی تقریب میں تقریر کر رہے تھے جو مسٹر کمال الدین احمد چیرمین آر ٹی سی کے خیر مقدم کے لئے ترتیب دی گئی تھی۔ مسٹر اسمٰعیل قریشی ایڈوکیٹ صدر انجمن ترقی اردو نے صدارت کی۔ مسٹر اسمٰعیل قریشی ایڈوکیٹ نے عادل آباد میں بعجلت ممکنہ اردو میڈیم کا جونیر کالج قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ پچھلے ایک سال سے عادل آباد کے اردو داں عوام جونیر کالج کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن اب تک اس کی پذیرائی نہیں ہوسکی، اب جبکہ نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو رہا ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو جونیر کالج کا قیام عمل میں لایا جائے۔ مسٹر کے آشا سابق ایم پی نے بھی اردو کو مستحقہ مقام دینے کی وکالت کی۔ مسٹر نرسا ریڈی نے اپنی تقریر کے دوران اس بات کا تیقن دیا کہ طلبہ کی تعداد اور شرائط کی تکمیل پر جونیر کالج قائم ہوسکتا ہے۔

مسٹر کمال الدین احمد چیرمین آر ٹی سی نے اردو کے مستقبل کو درخشاں قرار دیا اور بتایا کہ وہ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں تاہم اردو والوں کا فریضہ ہے کہ اردو کو آگے بڑھائیں اور نئی نسل کو اردو تعلیم سے آراستہ کریں۔ • نامہ نگار

اردو میڈیم جماعتوں کے لئے از سر نو درخواستیں پیش کرنے کی ضرورت

حیدرآباد: ۔ آندھرا پردیش نئے تعلیمی سال کا ابھی ابھی آغاز ہوا ہے اس لئے اردو والوں کا اولین فرض ہے کہ وہ اردو میڈیم جماعتوں کے لئے از سر نو درخواستیں پیش کریں، پروفیسر حبیب الرحمٰن جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو نے ایک بیان میں اس جانب بطور خاص توجہ منعطف کراتے ہوئے کہا ہے کہ شائقین اردو اور کارکنان انجمن کو چاہئے کہ اس خصوص میں بلا تاخیر اقدامات کریں۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن نے مزید کہا کہ ناظم تعلیم آندھرا پردیش نے قبل ازیں ہی ہدایات جاری کرتے ہوئے ضلع پریشد دل اور اضلاع کے ارباب تعلیم سے اس نوعیت کے کیسس کو بلا تاخیر آگے بڑھانے کی خواہش کی ہے۔ • نامہ نگار

تسکین قریشی کی وفات

میرٹھ: ۔ دنیائے شعر و ادب میں یہ خبر انتہائی حزن و ملال کے ساتھ سنی جائے گی کہ عظیم اردو شاعر جناب حضرت تسکین قریشی ۷۲ برس کی عمر میں آگرہ میڈیکل کالج میں ۲۴ رجون کو وفات پاگئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم کینسر کے مرض میں مبتلا تھے اور اسی سے ان کی جان گئی مرحوم سوروں ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے تھے ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھے ایک عرصے سے میرٹھ میں قیام پذیر تھے جناب عزیز لکھنوی کے تلامذہ میں اور جگر مرادآبادی کے مخصوص احباب میں تھے وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ گلگونہ و متاع تسکین آپ کے شعری دیوان ہیں اور خطوط جگر وغیرہ جیسی کتابیں آپ کی یادگار ہیں پسماندگان میں ایک بیوہ ایک بھائی اور ہزاروں احباب و تلامذہ شامل ہیں۔

• نامہ نگار

صفحہ ۱۱ سے آگے

کی نوعیت بدل دیتا ہے اور اس قسم کے سوال دیتا ہے مثلاً نذیر احمد نے اپنے مضمون "طریقۂ تعلیم" میں کیا کہا ہے؟ کیا یہ طریقۂ تعلیم آج کے لئے موزوں ہے؟ اپنے خیالات کا اظہار کیجئے یا اقبال کی فلاں نظم کو غور سے پڑھئے اور اس میں جو بات کہی گئی ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔ تو آپ کو تعجب ہوگا کہ طالب علم جواب دیتے وقت سوال کی بالکل پروا نہیں کرتا، وہ وہی کچھ لکھتا ہے جو اسے کلاس میں بتایا گیا ہے یعنی وہ نذیر احمد کی مکمل سوانح عمری اور ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیتا ہے اور اقبال کی شخصیت اور شاعری پر طولانی مضمون قلم بند کرتا ہے اور بیسیوں نقادوں کی رائیں اور ان کے اقوال نقل کرتا جاتا ہے۔

میرا کچھ ایسا اندازہ ہے کہ ہمارے اردو کے موجودہ اساتذہ اور معلمین جن میں سے اکثر ایم، اے اور پی، ایچ، ڈی ہوتے ہیں اور خود بھی تنقید یا تحقیق میں کچھ دخل رکھتے ہیں ہائی اسکول سے لے کر بی، اے اور ایم، اے کی سطح تک ہر جگہ پڑھانے کے لئے لکچر طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ نظم یا نثر کے اس سبق پر توجہ دینے کے بجائے جو نصاب میں شامل ہے اس مصنف کے بارے میں طول طویل لکچر دیتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کے حالات کے سلسلے میں جو نئی تحقیقات ہوتی ہیں وہ سب کی سب طالب علم کو بتا دینا چاہتے ہیں۔ مصنف کے بارے میں مختلف قسم کے نقادوں نے جو کچھ موافقت یا مخالفت میں لکھا ہے وہ سب مسائل چھیڑے جاتے ہیں اور یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ طالب علم کو ان سب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کے ذہن میں ان لکچروں کے بعد ایک طرح کی پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس علم کو مناسب طور پر ہضم نہ کرنے کی وجہ سے ایک طرح کے انتشار ذہنی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کا احترام کرنے کے بجائے وہ اس قسم کے فقروں سے اپنے جوابات شروع کرتا ہے۔

(۱) محمد حسین آزاد الفاظ کے طوطا مینا بناتے تھے۔ تنقید نگاری ان کے بس کی بات نہیں۔ انھیں تنقید نگار سمجھنا تنقید کے مفہوم سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

(۲) حالی کی مغربی ادب سے واقفیت سطحی تھی وہ اوسط درجے کا ذہن رکھتے تھے۔ وہ بہت معمولی فہم و ادراک کے مالک تھے۔

(۳) شبلی مشرق و مغرب کے درمیان معلق نظر آتے ہیں۔

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ طالب علموں کے جوابات میں باتیں بڑی اونچی نظر آتی ہیں مگر لکھنے کا طریقہ بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ پیراگرافوں کی تقسیم اور خیالات کی ترتیب مناسب نہیں ہوتی۔ آخر میں لکھنے کی بات شروع میں اور شروع میں لکھنے کی بات کہیں درمیان میں۔ پھر ان سب پر مستزاد زبان اور قواعد کی بے پناہ غلطیاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لکچروں کو طلبہ زبانی سن کر اساتذہ کے خیالات کو یاد کر لیتے یا اپنی کاپیوں پر نوٹ کر لیتے ہیں وہ تنقید و تبصرہ کی کتابیں براہ راست نہیں پڑھتے اس لئے املا کی ایسی ایسی غلطیاں ملتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک یونیورسٹی کی ایم، اے کی کاپیاں میرے پاس آئی ہیں اس میں الفاظ کے املا کی نوعیت یہ ہے

محتاباط بجائے محتاط، بےحسں بجائے بےحس،
سیاہ وسباق " سیاق وسباق، سیل حاصل " سیر حاصل
مقصوم " معصوم، طوائفت " طبائع
شبیل الحسن " شبیر الحسن، کی گرناں " کنی گنا

جب ایم، اے کی سطح پر تحریر کا یہ معیار ہے تو نیچے اتر کر بی، اے، انٹرمیڈیٹ اور ہائی اسکول کے پرچوں میں جس قسم کی اردو پڑھنے کے لئے ملتی ہے اس کا ذکر ہی کیا۔ یہی طالب علم ایم، اے کرنے کے بعد ریسرچ میں داخلہ لیتے ہیں۔ کسی گمنام اور غیر معروف شاعر کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتے ہیں اور اپنے نتائج کو ایک جلد بندھی ہوئی ٹائپ شدہ کتاب کی صورت میں داخل کر دیتے ہیں جن پر انھیں پی، ایچ، ڈی تفویض کر دی جاتی ہے۔ یہ تحقیقی کارنامہ یا تو زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو پاتا اور کسی یونیورسٹی کی لائبریری میں دفن ہو جاتا ہے یا اگر شائع ہو جاتا ہے تو بھی اس سے علم و ادب کی دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آتا نہ اس گمنام و غیر معروف مصنف کی حیثیت میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ البتہ ہمارا طالب علم اردو کا ڈاکٹر بن جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس بات کا مستحق سمجھتا ہے کہ آنے والی نسلوں کی ذہنی تربیت کے لئے سب سے پہلے اسے منتخب کیا جائے۔ اردو کی تعلیم و تدریس کے یہ مسائل ایسے ہیں جن پر اگر توجہ نہ دی گئی تو اس کے نتائج بہت عبرتناک ہوں گے۔

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

سنایا جائے۔ نظم کے اختتام پر شاعر کی شخصیت یا اس کے کلام کی خصوصیت کی طرف سرسری اشارہ کر دیا جائے جس کی حیثیت تعارف سے زیادہ نہ ہو۔

(۸) نظم و نثر کے اسباق پڑھانے کے علاوہ معلم کا یہ فرض بھی ہوتا تھا کہ وہ ساتھ ہی ساتھ قواعد زبان سے بھی طالب علم کو آگاہ کرتا چلے۔

(۹) طالب علم سے لکھنے کی جو مشقیں کرائی جاتی تھیں ان میں سب سے زیادہ زور اشعار کا مطلب اور مفہوم لکھنے، نظم کا مرکزی خیال یا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کرنے، نثر کے دیے ہوئے ٹکڑوں یا پیراگرافوں کو غور سے پڑھ کر اس کا خلاصہ اپنی زبان میں بیان کرنے پر ہوتا تھا۔ قواعد کی مشق کے لیے ترکیب صرفی اور ترکیب نحوی کرائی جاتی تھی کچھ سوالات اور مشقیں ایسی بھی ہوتی تھیں جن میں الفاظ کا ایک ذخیرہ دے دیا جاتا تھا اور طالب علم سے کہا جاتا تھا کہ وہ ان الفاظ کے معنی لکھے اور اسے اپنے جملوں میں استعمال کرے۔ مضمون نویسی اس قسم کی ہوتی تھی کہ طالب علم کو ایک ایسا عنوان دیا جائے جس کے لیے اسے کتابوں کے مطالعے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ صرف اس کے انداز بیان اور اس کی تحریری صلاحیت کو آزمایا جائے مثلاً کسی سفر کا حال، "اسکول میں میرا پہلا دن" میں نے گرمی کی چھٹیاں کیسے گزاریں وغیرہ۔

بی اے کی سطح پر جو کتابیں نصاب میں شامل ہوتی تھیں انھیں پڑھاتے وقت بھی ان کے متن پر خاصا زور دیا جاتا تھا۔ البتہ تنقید کا معیار اب کچھ بلند ہو جاتا تھا۔ دیوان غالب پڑھاتے وقت پہلے غالب کے اشعار کے معنی و مفہوم کی وضاحت ہوتی تھی، صنائع بدائع اور تلمیحات و اشارات کو ایک ایک کرکے بیان کیا جاتا تھا پھر غالب کی شخصیت اور شاعری پر کچھ لکھوا دیے جاتے تھے۔ یہی انداز دوسری کتابوں کو پڑھاتے وقت اختیار کیا جاتا تھا۔ تنقیدی سوالات کے جواب میں عام طور پر توضیح و ترجمانی یا تحسین کا انداز ہوتا تھا۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں ایک تبدیلی یہ بھی ہوئی ہے کہ اب یونیورسٹیوں کے علاوہ کالجوں اور اسکولوں میں بھی اردو کے جو اساتذہ رکھے جاتے تھے وہ اردو کے ایم۔ اے یا پی۔ ایچ۔ ڈی ہوتے ہیں۔ ہائی اسکول سے لے کر بی۔ اے تک اب نصاب کی نوعیت ایک جیسی ہے یعنی اب پوری پوری کتابیں رکھنے کا دستور کم ہو گیا ہے۔ نظم میں ولی سے لے کر اقبال اور جوش تک اور نثر میں میر امن سے لے کر عبدالحق اور ابوالکلام آزاد تک مستند اور صف اول کے مصنفوں کی ایک بندھی ٹکی فہرست ہوتی ہے اور تاریخی ترتیب سے ان کی نظم یا نثر کے نمونے جمع کر دیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ہائی اسکول سے لے کر بی۔ اے تک ایک ہی معیار کے اسباق انتخاب میں شامل ہوتے ہیں۔ مصنف بھی ایک ہی ہوتا ہے البتہ تحریر کا ٹکڑا مختلف ہوتا ہے مثلاً باغ و بہار سے پہلے درویش کی سیر ہائی اسکول میں ہے تو تیسرے درویش کی سیر انٹرمیڈیٹ میں۔ کبھی کبھی ان میں تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ میر امن، رجب علی بیگ سرور، سرسید، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم اور عبدالحق کے مضامین اور ولی، سراج، میر، سودا، میر حسن، نظیر اکبرآبادی، انیس، دبیر، غالب، ذوق، مومن، ناسخ، آتش، داغ، امیر، حسرت موہانی، اقبال، جوش اور جگر کا کلام آپ ان انتخابات میں دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اسکول کی سطح سے لے کر بی۔ اے تک ہم ایک ہی طرح کے مصنفین اور ایک ہی طرح کی تحریروں کو بار بار پڑھاتے ہیں۔

اب میں اس مسئلے پر آتا ہوں کہ ہمارے اساتذہ ان طلبہ کو کس انداز سے پڑھاتے ہیں۔ اس کا اندازہ امتحان کی کاپیوں سے ہو سکتا ہے۔ اچھے سے اچھے طالب علم کے جوابات کا وہ حصہ سب سے کمزور ہوتا ہے جہاں اسے نظم یا نثر کے چند ٹکڑوں کا مفہوم لکھنا ہوتا ہے۔ طالب علم کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو شعر کی نثر بنا کر چھوڑ دیتا ہے اور نثر کے ٹکڑے کو یا تو ویسا ہی نقل کر دیتا ہے یا ایک آدھ لفظ اپنی طرف سے بدل دیتا ہے۔ اب تنقیدی سوالات کی طرف آئیے۔ کچھ ممتحن تو ایسے سوالات دیتے ہیں جو عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں مثلاً سودا کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے، انیس کے مراثی پر تبصرہ کیجیے، غالب کے خطوط پر روشنی ڈالیے، اقبال کی شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔ ایسے سوالوں کے جوابات پڑھتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ طالب علم مصنف کے نام و نسب اور زندگی کے حالات سے متعلق بہت کچھ تفصیل اور بے تکی معلومات کا انبار لگانا شروع کر دیتا ہے اور کلام پر تبصرہ و تنقید کے سلسلے میں متضاد رایوں کو بے ڈھنگے انداز میں لکھتا جاتا ہے۔ ہر ہر سطر میں بقول فلاں اور بقول فلاں کی بھرمار ہوتی ہے۔ سارے طالب علموں کے جوابات میں یکسانیت ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات اور ان کا پیرایۂ بیان ڈھلا ڈھلایا اور ریڈی میڈ طور پر انھیں کہیں سے حاصل ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں فرق نظر آتا ہے تو وہ سواد خط کا فرق ہے اور بس۔ اور اگر ہم جیسا کوئی ممتحن جو اس یکسانیت سے عاجز آکر نیا پرچہ مرتب کرتے وقت سوالوں

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

خلیل الرحمن اعظمی

میرا صفحہ

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس قول کی روشنی میں غالباً یہ کہنا کچھ ایسا غلط نہ ہوگا کہ استاد کی شخصیت اور اس کے طریقۂ تعلیم کا اندازہ اس کے شاگردوں سے لگایا جاسکتا ہے اور شاگردوں کی ذہنی سطح اور ان کے طرزِ فکر و طرزِ گفتار کو سمجھنے کا سب سے بہتر ذریعہ ان کے امتحان کی کاپیاں ہیں۔ اسے میری خوش نصیبی سمجھئے یا بدنصیبی کہ گذشتہ پندرہ برسوں سے ہندوستان کی مختلف یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے ان طلبہ کا ممتحن بننے کا اتفاق ہوا ہے جو اردو زبان و ادب کا بطور ایک اختیاری مضمون کے مطالعہ کرتے ہیں، ان میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ سے لے کر بی، اے اور ایم، اے کی سطح تک کے طلبہ شامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جو کاپیاں ممتحن کے پاس آتی ہیں وہ سب یکساں معیار کی نہیں ہوتیں، اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے، ان میں اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ ہر طرح کے طالب علم ہوتے ہیں جو اپنے اپنے معیار سے سوالات کے جواب لکھتے ہیں مگر ان کے جوابات سے مجموعی طور پر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھیں کس نہج سے پڑھایا گیا ہے اور ان کے خیالات پر کس حد تک استاد کی چھاپ نمایاں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا عام طور پر کیا انداز تھا۔

جہاں تک یونی ورسٹیوں کا تعلق ہے آزادی سے پہلے معدودے چند یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم ایم، اے اور پی، ایچ ڈی کی سطح تک ہوتی تھی، البتہ اسکولوں اور کالجوں میں ہر جگہ اردو بطور ایک اختیاری مضمون کے پڑھائی جاتی تھی۔ چونکہ اس زمانے میں اردو کے ایم، اے اور پی، ایچ ڈی خال خال ہوتے تھے اس لئے ہائی اسکول سے لے کر بی، اے تک عموماً ایسے اساتذہ اور معلمین اردو کی تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے جن کی اپنی تعلیم مشرقی انداز کی ہوتی تھی اس قسم کے معلموں کا سلسلۂ نسب آپ وحید الدین سلیم، احسن مارہروی اور حامد حسن قادری وغیرہ جیسے بزرگوں سے لا سکتے ہیں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس زمانے میں ہائی اسکول میں نظم و نثر کا ایک ملا جلا انتخاب نصاب کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ میں بھی ایک انتخاب ہوتا تھا مگر اس کی سطح ذرا بلند ہوتی تھی، اس انتخاب کے ساتھ بعض کتابیں بھی نصاب میں شامل کرلی جاتی تھیں جیسے شریف زادہ، پریم چند کے افسانوں کا کوئی مجموعہ یا مسدس حالی، بی، اے میں انتخاب کے بجائے پوری پوری کتابیں نصاب میں رکھی جاتی تھیں جیسے دیوان غالب، انتخاب کلام میر، بانگ درا، میدان عمل، انارکلی، توبۃ النصوح، نشاط روح وغیرہ۔

ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی سطح تک طریقۂ تعلیم عام طور پر یہ تھا۔

(۱) نظم یا نثر کا جو سبق پڑھانا ہے اس کی بلند خوانی طالب علم سے کرائی جائے۔

(۲) طالب علم نے بلند خوانی کے دوران میں اگر تلفظ کی غلطیاں کی ہیں تو اسے صحیح تلفظ سے آگاہ کیا جائے۔

(۳) اگر شعر کو ناموزوں پڑھا گیا ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا جائے اور اسے صحیح اور موزوں پڑھنا سکھایا جائے۔

(۴) فارسی ترکیبوں میں اضافت کی نوعیت طالب علم پر واضح نہیں ہے تو اسے واضح کیا جائے۔

(۵) تمام مشکل الفاظ کے معنی بتائے جائیں اور ہوسکے تو ان کے مترادفات سے بھی آگاہ کیا جائے۔ مترادف الفاظ میں اگر نازک امتیازات ہیں تو ان کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔

(۶) نثر کا سبق پڑھایا جائے تو ہر ہر پیراگراف پر ٹھہر کر اس پیراگراف میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اسے سادہ اور مختصر طور پر بیان کردیا جائے۔ سبق کے ختم ہونے کے بعد پھر اس مضمون پر مجموعی نظر ڈالی جائے اور مصنف کے خیالات کی مزید وضاحت کی جائے۔ آخر میں اختصار کے ساتھ اس مضمون میں خصوصی طور پر نثر کی جو خصوصیات یا طرزِ نگارش کے جو لوازم ملتے ہیں ان پر روشنی ڈالی جائے۔

(۷) نظم کا سبق پڑھایا جائے تو ہر ہر شعر کے معنی و مفہوم کی وضاحت کی جائے، جو بات تشبیہ و استعارے کے پردے میں کہی گئی ہے اسے صاف صاف بیان کیا جائے۔ اگر کوئی تلمیح استعمال کی گئی ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا جائے اور اس تلمیح کے مفہوم پر روشنی ڈالی جائے۔ شعر میں کوئی صنعت مثلاً حسن تعلیل، لف و نشر یا صنعت تضاد وغیرہ استعمال کی گئی ہے تو اسے طالب علم پر واضح کردیا جائے اس صنعت کی ایک آدھ اور مثالیں بتا دی جائیں۔ شعر زیر بحث کے ہم معنی و ہم مضمون کوئی اور شعر ہوتا سے بھی اس موقع پر

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم، اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو سے شائع کیا
REGD. No-L-922 فون نمبر ۲۹ R. No-2186/57